رفیق احمد

اسلامی ایشیا کا اقتصادی بلاک
فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں

نفس مضمون

زیرِ نظر مقالے میں اقبالؒ کے معاشی افکار پر بحث مقصود نہیں۔ گفتگو کا محور یہ نکتہ ہے کہ انہوں نے ایشیا کے اسلامی ممالک کے درمیان وسیع تر اتحاد کا جو خواب دیکھا تھا اس کی نوعیت کیا تھی اور دورِ حاضر میں اس خواب کی تکمیل کے لئے اقتصادی عوامل کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آجکل دُنیا بھر میں ہمہ ارضیت (globalization) اور معاشی علاقائیت (economic regionalism) کی ثند ہوائیں چل رہی ہیں، اور مختلف خطوں کے ممالک اپنے اقتصادی ڈھانچوں کی حفاظت اور فروغ کے لئے باہمی گروہ بندی کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال یورپین یونین (EU) کی ہے۔ اقبالؒ کے دور میں ہم خیال ممالک کے درمیان معاشی اشتراک یا مکمل اتحاد کی وہ شکلیں ابھی نہیں اُبھری تھیں جن کا نظارہ ہم یورپ، امریکہ یا جنوب مشرقی ایشیا میں دیکھتے ہیں۔ یہ ایک نئی معاشی حکمت عملی ہے جس کا ادراک انسانوں کو دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں کے بعد ہوا ہے۔ اگر اسلامی ممالک اس نئی طاقتور حکمت عملی کا دامن مضبوطی سے پکڑ سکیں تو اقبالؒ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جو انہوں نے دُنیا میں وسیع تر تہذیبی، سیاسی اور معاشی احیائے اسلام کے بارے میں دیکھا تھا یعنی اس احیائے اسلام کا جس کی بدولت تمام انسان ہر نوع کی غربت اور غلامی سے نجات پا سکتے ہیں اور ایک خوشحال اور فروغ پذیر رُوحانی معاشرے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

وسیع تر معنوں میں اسلامی ایشیا میں عرب ممالک اور وسطی، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے اسلامی ممالک شامل ہیں۔ مثالی صورتِ حال تو یہ ہوگی کہ یہ سارے ممالک معاشی طور پر ایک مضبوط باہمی تنظیم

سے منسلک ہوں۔ لیکن اس راستے میں کئی عملی رکاوٹیں حائل ہیں۔ جغرافیائی طور پر زیادہ فطری اشتراک وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک کے درمیان ہوسکتا ہے۔ اِقبالؒ کی تحریروں میں بھی جس اسلامی ایشیا کا بار بار ذکر آتا ہے وہ یہی ممالک ہیں جن میں اب پاکستان بھی شامل ہے۔ ترکی، ایران اور پاکستان نے 1964ء میں علاقائی تعاون برائے ترقی (RCD) کے نام کی ایک باہمی معاشی تنظیم بنائی تھی۔ 1990ء میں تشکیل نو کے بعد اس کا نام تنظیم برائے معاشی تعاون (ECO) رکھا گیا۔ 1992ء میں اس تنظیم کے رُکن ممالک کی تعداد دس ہوگئی جس میں ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان کے علاوہ روسی تسلط سے آزاد شدہ چھ ریاستیں، آذربائیجان، قزاقستان، کرغستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان، بھی شامل ہیں۔ یہ باہمی معاشی اشتراک یقیناً اِقبالؒ کے خواب کی تکمیل کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ لیکن یہ اس قسم کا مضبوط باہمی اتحاد نہیں جو نتائج کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو اور جو مغرب کی نو استعماریت اور محتاجی سے محفوظ اور اسلامی اقدار و شعائر کا علم بردار ہو۔

اس مقالے کے مباحث دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصے میں ایشیائی اسلامی اتحاد کے حوالے سے فکر اِقبالؒ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصے میں ان عوامل پر زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے جن کی مدد سے وسط ایشیا کے اسلامی ممالک ایک مضبوط اقتصادی بلاک کی حیثیت سے اُبھر سکتے ہیں اور سارے ایشیا کے لئے مغربی بالادستی کے مقابلے میں آزادی اور خودمختاری کی ضمانت بن سکتے ہیں۔ بقول اِقبالؒ:

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

I

اسلام کا عالمی کردار

اسلامی اتحاد کے بارے اِقبالؒ کے خیالات اور تجاویز کا بنیادی سرچشمہ ان کا یہ پختہ یقین ہے کہ بنی نوع انسان کو اپنے موجودہ مصائب سے نکلنے کے لئے ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جو رنگ و نسل

کے امتیاز کی بجائے احترام آدمیت کی سوچ پر قائم ہو۔ اس سوچ کا عملی مظاہرہ صرف اسلام کا سماجی نظام پیش کرتا ہے۔ ان کا بیان ہے:

''اگر انسانی معاشرے کا مقصد امن اور تحفظ کو اقوام کے لئے یقینی بنانا اور ان کے موجودہ سماجی ڈھانچے کو ایک واحد سماجی نظام میں تبدیل کرنا ہے تو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کسی اور سماجی نظم کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ ایسا اس لئے ہے کہ میرے مطالعۂ قرآن کے مطابق اسلام کو محض فرد کی اخلاقی اصلاح مقصود نہیں بلکہ اسے بنی نوع انسان کی معاشرتی زندگی میں ایک بتدریج لیکن بنیادی انقلاب مطلوب ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس کی جگہ ایک خالصتاً انسانی شعور کو جنم دے۔ یہ صرف اور صرف اسلام ہی تھا جس نے پہلی بار بنی نوع انسان کو یہ پیغام دیا کہ مذہب نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی اور نہ نجی، بلکہ سراسر انسانی ہے۔''(1)

علم کی ترقی اور سائنس کے عدیم المثال ارتقاء کے باوجود انسانی بستیاں جن خونریزیوں، نفرتوں اور ظلم وستم کا شکار ہیں ان کا تذکرہ اقبالؒ کی تقاریر، بیانات اور اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔ یکم جنوری 1938ء کو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن کے افتتاح کے موقع پر نئے سال کا پیغام دیتے ہوئے انہوں نے بصد حسرت فرمایا:

''جب میں دُنیا کو نئے سال کی آمد پر خوشیاں مناتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ حبشہ ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین، انسان کے ارضی وطن پر ہر چار سو مصیبتیں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں کو بے رحمی سے تہہ تیغ کیا جا رہا ہے۔ سائنس نے تباہی کے جو انجن تخلیق کئے ہیں وہ انسان کی ثقافتی کامیابیوں کی عظیم علامتوں کو مٹا رہے ہیں۔ وہ حکومتیں جو آگ اور خون کے اس ڈرامے میں خود ملوث نہیں وہ اقتصادی طور پر کمزور اقوام کا خون چوس رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمین پر حشر بپا ہو گیا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں ہے۔''(2)

سچی بات تو یہ ہے کہ آج جبکہ اِقبالؒ کو فوت ہوئے چھ دہائیاں گذر چکی ہیں عالمی منظر مندرجہ بالا بیان سے کچھ مختلف نظر نہیں آ رہا۔ خاص کر افریقہ، ایشیا، اور یورپ کے کچھ ممالک خونریزیوں کی لپیٹ میں ہیں، چاہے یہ فساد انگیزیاں باہمی جنگوں کی شکل میں ہوں یا اندرونی جھگڑوں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نسل کُشی کی وارداتیں بھی ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ نئے عالمی نظام کی آڑ میں ترقی یافتہ قوموں نے دُنیا کی تین چوتھائی آبادی کو معاشی طور پر یرغمال بنا رکھا ہے۔ یہ آبادی یا تو خطِ غربت سے نیچے ہے یا اس کے قریب۔ اس سلسلے میں جنوبی ایشیا غالباً سب سے زیادہ غربت زدہ ہے۔(3)

اِقبالؒ نے اپنی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق میں غریب اقوام کے معاشی استحصال کا نقشہ یوں کھینچا ہے:(4)

امتے بر امتے دیگر چرد
دانہ این می کاد، آن حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک، ایں فکر چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

آخری شعر میں مغرب کے بنکاری نظام کا ذکر ہے، جس نے ضعیف اقوام کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اِقبالؒ کے نزدیک ایک وقت ایسا آئے گا جب خاص طور پر ایشیائی قومیں مغرب کی استحصالی اور اکتسابی (acquisitive) اقتصادیات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں گی اور اس کا سہرا دینِ اسلام کے سر ہوگا جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی بے مہار انفرادیت کا قائل نہیں بلکہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتے ہوئے

یہ تربیت دیتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ اور انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔ اسلام کے امکانات ختم نہیں ہوئے۔ عہد حاضر میں اسلام کی قوتِ تخلیق کے بارے میں اِقبالؒ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

''یہ ابھی ایک نئی دُنیا تخلیق کر سکتا ہے جس میں آدمی کا معاشرتی رُتبہ اس کی ذات اور رنگ سے متعین نہیں کیا جاتا یا اس دولت سے جو وہ کماتا ہے بلکہ یہ اس نوع کی زندگی سے متعین ہوتا ہے جو وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غریب امیر پر ٹیکس لگاتا ہے، جہاں انسانی معاشرے کی بنیاد پیٹوں کی مساوات نہیں بلکہ جذبوں کی مساوات پر ہوتی ہے، جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے، جہاں نجی ملکیت ایک امانت ہے، اور جہاں سرمایہ کو اتنا ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ دولت کے اصل پیدا کرنے والے پر برتری حاصل کر لے۔''(5)

دوسرے الفاظ میں اسلام محض ایک اخلاقی نظریہ کا نام نہیں بلکہ یہ اپنی اخلاقی بنیادوں پر ایک واضح تمدنی اور سماجی نظام قائم کرتا ہے جس کو اپنانے سے دُنیا بھر کے انسان اپنے فطری امتیازات کے باوجود احساسات اور افکار میں ہم آہنگی اور اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اسلام ہی اُمید کی وہ کرن ہے جس سے ایک ایسا انسانی معاشرتی نظام معرضِ وجود میں آ سکتا ہے جو رنگ، نسل، زبان اور قومی تعصّبات کی بجائے ایک عالم گیر انسانیت کا حامل ہو۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بُتاں رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اسلام کے عالمی کردار کے حوالے سے اِقبالؒ نے جو تاثرات 1933ء میں بیان کئے تھے وہ آج کے حالات سے بھی مطابقت رکھتے ہیں:

''مختلف یورپی ممالک کے دورے اور جدید دُنیا کی اخلاقی افراتفری کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ بحیثیت دین اسلام کے لئے ایک عظیم موقعہ آن پہنچا ہے۔ یورپ میں لکھوکھا مرد اور عورتیں یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہیں کہ اسلام اور اس کے ثقافتی تصورات کیا ہیں۔ مسلمانوں کی نوجوان نسل جس قدر جلد اس حقیقت کا ادراک کرے گی اتنا ہی بہتر ہوگا۔''(6)

اسلامی ایشیا کی اھمیت

اسلام انسانی قدروں پر مبنی جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اِقبالؒ کے نزدیک اس کے فروغ وفراغ کی ابتداء قدرتی طور پر ان ممالک سے ہونی چاہیے جو اسلام کے نام لیوا ہیں اور جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ اس میں عرب اور غیر عرب مسلم ممالک دونوں شامل ہیں۔ البتہ اِقبالؒ کے نزدیک اسلام کے زِیر اثر انسانی یک جہتی کا زیادہ مؤثر مظاہرہ اسلامی ایشیا میں ہوا ہے جہاں مختلف نسلیں اور قبیلے آباد ہیں۔ یہ سب فطری امتیازات کے باوجود تمدنی نقطۂ نظر سے اسلام کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔(7) لہٰذا ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک پر نسبتاً زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مغرب کے استحصالی نظام کے مقابلے میں اپنی صفیں درست کریں اور ایک مضبوط انسانی معاشرے کی تشکیل کریں۔ اِقبالؒ کے زمانے میں ترکی، ایران اور افغانستان ہی ایسے آزاد ممالک تھے جو ان کی توجہ کا مرکز بنے۔ یہ دائرہ اب وسیع ہوگیا ہے اور اس میں اب پاکستان کے علاوہ روس سے آزاد شدہ چھ اور ممالک بھی شامل ہیں۔

اسلامی ایشیا کی یک جہتی کی بنیاد بہت سے تاریخی، ادبی، قانونی اور ثقافتی عوامل پر ہے۔ اِقبالؒ نے ان عوامل کا ذکر اپنی کئی تحریروں میں کیا ہے۔(8) غیر عرب نسلوں کا تحریر کردہ ادب اور فکر کا قیمتی سرمایہ، مذہبی عقیدت کا اتحاد، ثقافت کی یکسانیت، شرعی قوانین کی تدوین، جغرافیائی وحدت۔ یہ اور اس قسم کے دیگر عناصر نے ایشیائی اسلامی ممالک کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ انسانی رشتوں پر مبنی ایک نئے عالمی نظام کی ترویج کا باعث بن سکتے ہیں۔ اپنے مشہور خطبۂ الہ آباد میں اِقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کو یاد دِلایا کہ ایشیا اور بالخصوص اسلامی ایشیا کی طرف سے ان پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک علیحدہ مملکت قائم کر

کے انسانیت کے اس بلند اور واضح تصور پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں جو اسلام نے دیا ہے۔(9) ظاہر ہے کہ یہ کردار اب پاکستان نے ادا کرنا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِقبالؒ جو عالم گیر انسانی معاشرے کے داعی ہیں اسلامی ایشیا کے حوالے سے علاقائی قومیت اور وطنیت کی ترقی پر کیوں زور دیتے ہیں۔ اِقبالؒ درحقیقت ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے۔ عالم گیر معاشرے کا قیام ایک تصوراتی نصب العین ہے جسے عملی طور پر الگ الگ سیاسی وحدتوں کے تعاون واتحاد سے حاصل کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ یہ وحدتیں ایک مشترکہ رُوحانی ورثہ سے منسلک ہوں۔ ان کا اپنا بیان ملاحظہ کیجئے:

''ہر مسلم قوم کو اپنی ذات کی گہرائیوں میں کھو جانا چاہیے اور عارضی طور پر اپنی نگاہوں کا مرکز صرف اپنی ذات کو بنانا چاہیے، اس وقت تک جب تک سب مضبوط اور طاقتور ہو کر جمہوریتوں کا ایک زندہ خاندان نہ بن جائیں۔ قوم پسند مفکرین کے مطابق ایک حقیقی اور جاندار وحدت اتنی آسان نہیں کہ محض علامتی بالادستی سے حاصل ہو جائے۔ یہ تو تب آشکار ہوتی ہے جب آزاد وحدتوں کی کثرت کسی مشترکہ رُوحانی فیضان کے زِیر اثر اپنی نسلی رقابتوں کے درمیان ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرے۔ میری رائے میں اسلام نہ تو قوم پرستی کا نام ہے، نہ شہنشاہیت کا۔ اسے تو انجمن اقوام سمجھنا چاہیے جو محض حوالے کے طور پر مصنوعی حد بندیوں اور نسلی امتیازات کو تسلیم کرتی ہے اور جس کا یہ ہرگز منشاء نہیں کہ وہ اپنے اراکین کے سماجی افق کو محدود کر دے۔''(10)

اِقبالؒ کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ قومیت کے خلاف تھے۔ مندرجہ بالا بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ وہ دراصل اس قوم پرستی کے خلاف تھے جو مغرب کے زِیر اثر مختلف قوموں میں فساد پیدا کرتی ہے، انہیں تباہ کن مسابقت پر ابھارتی ہے، تمام اخلاقی قوائد کو بالائے طاق رکھ کر ریاست کو خدا تصور کرتی ہے۔ اور اس طرح مغربی اقوام کی استحصالی بالادستی کو قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک مسلم اکثریت والے ممالک کا تعلق ہے، اِقبالؒ کی رائے میں وہاں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کرتا

ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے اور اسلام کی اعلیٰ انسانی اقدار وہاں کی قومیت کی بنیاد ہیں۔(11) یہی وجہ ہے کہ اِقبالؒ تمام مسلمان وحدتوں یا ملکوں کو آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتے تھے۔ آزاد مسلم انڈیا یا پاکستان کا مطالبہ بھی اس خواہش کا اظہار تھا۔

اسی فکر کے تسلسل میں کہا جا سکتا ہے کہ اِقبالؒ کے زمانے میں جب کبھی کوئی مسلم وحدت یا ملک ظلم و ستم اور استحصال کا شکار بنا تو اِقبالؒ سراپا احتجاج بن گئے۔ برطانوی استعمار پرستی نے اسلامی دُنیا کے قلب میں یہودی فلسطین کی شکل میں اپنے پنجے گاڑنے کا جو پروگرام بنا رکھا تھا اِقبالؒ نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ اسی طرح 1933ء میں چینی ترکستان میں بغاوت اور روسی ترکستان میں بے اطمینانی کے حوالے سے اِقبالؒ نے اُمید ظاہر کی کہ چینی ترکستان کی شکل میں ایک مضبوط اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آجائے گی جو وسطی ایشیا کو بالشویکی دہریت سے محفوظ کر دے گی۔(12) وہ تا حیات کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کی حمایت کرتے رہے۔ یورپ نے اسلامی ممالک میں اپنی جارحیت پر پردہ ڈالنے کے لئے ان ممالک میں اتحاد کی کوششوں کو جارحیت کے مترادف قرار دیا اور اس کے لئے پین اسلام ازم کی اصطلاح وضع کی اور یہ پراپیگنڈا کیا کہ مسلمان دُنیا میں ایک واحد اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اِقبالؒ اور ان کے پیش رو جمال الدین افغانی اسلامی وحدتوں میں باہمی تعاون کے علم بردار تھے۔ اِقبالؒ نے اس اصطلاح کی اپنے افکار کی روشنی میں توضیح کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ اگر اسلام کے حوالے سے اس اصطلاح کا کوئی مطلب نکل سکتا ہے تو وہ پین ہیومن ازم (Pan Humanism) ہے، یعنی انسان دوستی۔(13) پین ازم کے مقابلے میں اسلام کی عالم گیر ریاست بہت مختلف ہے۔ اسلام ایک عالم گیر ریاست یا سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔(14)

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر مغربی قوموں نے جو لیگ آف نیشنز (League of Nations) بنائی تھی وہ فلسطین اور دیگر علاقوں میں یورپ کی چیرہ دستیوں کو روکنے میں قطعاً ناکام ہوگئی تھی۔ اِقبالؒ نے اسے انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ادارہ قرار دیا اور ایشیائی اسلامی ممالک پر زور دیا کہ وہ ایک الگ مشرقی

لیگ آف نیشنز (Eastern League of Nations) بنائیں کیونکہ اگر مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں متحد ہوگئیں تو بچ جائیں گی۔ ان کے خیال میں زود یا بدیر اتحاد ہوگا اور دُنیا ایک بار پھر جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔(15)

اندرونی اصلاح

اسلامی دُنیا اور بالخصوص ایشیا کے اسلامی ممالک کے ممکنہ کردار کے بارے میں اِقبالؒ نے جو تصورات پیش کئے ہیں ان کے قابلِ عمل ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ پہلے یہ ممالک خود ایک ایسا مثالی اور انسان دوست معاشرہ تعمیر کریں جو اسلام کی اخلاقی اور سماجی اقدار کی عکاسی کرتا ہو۔ اگرچہ ان ممالک کے معاشرے بہت حد تک نسل اور رنگ کی اس عصبیت سے پاک ہیں جو مغربی سوسائٹی کا طرۂ امتیاز ہے۔ صدیوں کی زوال پذیری نے انہیں سیاسی اور معاشی طور پر زنگ آلود کر دیا ہے اور انہیں کئی فرسودہ رسوم ورواج میں جکڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد جہالت اور غربت کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ اِقبالؒ ان مسائل سے پوری طرح آگاہ تھے اور انہیں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی روشنی میں جدید تقاضوں کے مطابق حل کرنے کے متمنی تھے۔ پیام مشرق کے دیباچے میں انہوں نے واضح طور پر اندرونی انقلاب کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے:

> ''مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب برپا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآن نے اِن اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیرو ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔''(16)

اِقبالؒ نے اسلامی ممالک کے اندر ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے لئے کوئی مربوط پروگرام نہیں دیا البتہ ان کی تحریروں اور اشعار میں جا بجا ایسے اشارے ملتے ہیں جن کا تعلق سیاسی، سماجی، اقتصادی اور قانونی اصلاحات سے ہے۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو مساوات، اخوت اور یک جہتی کا کامل نمونہ ہو اور جس میں مادیت سے پیدا شدہ خرابیاں مفقود ہوں۔ ایسی سوسائٹی مغربی اقوام کی طرح تنگ نظر اور کوتاہ بیں نہ ہوگی جس کا مقصد امراء کی خوش حالی کے لئے غریبوں کا استحصال ہو۔ اس قسم کی سوسائٹی کو وہ رُوحانی جمہوریت کے نام سے پکارتے ہیں۔(17) ظاہر ہے کہ جب تک اسلامی ممالک اپنے معاشروں کو اسلام کی اخلاقی اور رُوحانی اقدار کے مطابق نہیں ڈھالتے وہ صحیح معنوں میں کوئی ٹھوس عالمی کردار ادا نہیں کر سکتے۔

ہم زیرِ نظر مقالے میں اِقبالؒ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار پر زیادہ تفصیل سے بحث نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا موضوع مختلف ہے۔ البتہ انہوں نے اسلامی معاشروں کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں فقہ کی تدوین نو کا جو سوال اٹھایا ہے اس کا مختصر ذکر بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں واضح طور پر کہا:

> ''ہمارے مسائل کا حل اسلامی قوانین کے نفاذ میں ہے اور موجودہ نظریات کی روشنی میں اس میں مزید ترقی کا امکان ہے۔ اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کا بنیادی معاشی ضروریات حاصل کرنے کا حق محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے۔''(18)

اس سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ قابلِ غور ہے اور وہ ہے اجتہاد کا مسئلہ جس پر اِقبالؒ نے بہت زور دیا ہے۔ ان کی یہ پُر مغز تحریر ماہرین فقہ کے لئے قابل توجہ ہے:

> ''فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلام کہا جاتا ہے، نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بناء پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً

کئے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے واقعی مناسب اور قابلِ عمل تھے۔ مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں۔ اگر چہ شیعہ مفسروں نے بعض اصولوں کی تشریح میں ایک حیرت انگیز وسعت نظر سے کام لیا ہے۔ تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعت اسلام کی جو توضیح جناب ابوحنیفہؒ نے کی ہے ویسی کسی مفسر نے آج تک نہیں کی۔ قانون اسلام کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بناء پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے۔'' (19)

ظاہر ہے کہ اِقبالؒ کی یہ خواہش ابھی تک پوری نہیں ہوئی، لیکن ایک بات واضح ہے کہ اسلامی ایشیا جو اب آزاد مملکتوں پر مشتمل ہے، اس وقت تک ایک صحیح اور قوی انسان دوست معاشرے کی تعمیر نہیں کر سکتا جب تک وہ بقول اِقبالؒ اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں جدید قانونی ڈھانچے کی تشکیل نہیں کرتا۔

اقتصادی آزادی

اِقبالؒ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ قوموں کی حقیقی آزادی کا سرچشمہ ان کی اقتصادی آزادی ہے۔ اسلامی ایشیا کا اتحاد اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا جب تک اقتصادی خود مختاری حاصل نہ ہو۔ ان کے نزدیک سیاسی آزادی کی شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہوتا ہے۔ (20) 1920ء میں اِقبالؒ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے وائس چانسلر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اس پیش کش کو رد کرتے ہوئے انہوں نے برملا کہا کہ مسلمانوں کو ادب اور فلسفے کی تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں جتنی فنی تعلیم کی جو انہیں معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ لہٰذا نئی یونیورسٹی کے کارپردازوں کو چاہیے کہ وہ اسے ایک ایسا ادارہ بنائیں جس میں طلبہ کو قومی سائنس کے فنی پہلوؤں کا ماہر بنایا جائے اور ساتھ ہی انہیں

مذہبی تعلیم سے آشنا کیا جائے۔ ان کے الفاظ میں سیاسی آزادی سے پہلے معاشی آزادی کا حصول ضروری ہے۔(21)

اقتصادی آزادی کا تصور اجتماعی اور انفرادی دونوں صورتوں میں اہمیت رکھتا ہے۔ اگر انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معاشی فلاح و بہبود کا مقصد انسان کی ذات اور اس کے حوالے سے اس کی تہذیب و تمدن کی حفاظت اور پرورش ہے۔ اس مقصد کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ غربت ہے جو قوائے انسانی پر بہت اثر ڈالتی ہے اور بسا اوقات انسانی رُوح کے روشن آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کے اپنے الفاظ میں پہلا کام یہ کرنا چاہیے کہ ''ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو، گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دِل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دِل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔''(22)

اِقبالؒ نے اپنے مشہور لیکچر ''ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر'' میں مسلمانوں کی مجموعی غربت پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں تین اہم وجوہات کی نشاندہی کی ہے۔ اوّل وسیع تر بین الاقوامی عوامل جو قوموں میں اُونچ نیچ پیدا کرتے ہیں، دوئم تاریخی تعصّبات اور رویے اور اخلاقی زوال جو لوگوں کو معاشی طور پر آگے نہیں بڑھنے دیتے، اور سوئم حکومت کی غیر موافق پالیسیاں۔ اِقبالؒ کے خیال میں کسی قوم کی مجموعی معاشی صورتِ حال صرف اس وقت تسلی بخش ہوتی ہے جب لوگ سرکاری ملازمتوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے اپنی ہنرمندی میں اضافہ کرتے ہیں اور اپنی دُنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ یہی راستہ ہے آگے بڑھنے کا لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط اخلاقی اور رُوحانی طور پر اچھا مسلمان بننا ہے۔(23)

اِقبالؒ کے دورِ زندگی میں ایشیا کے مختلف ممالک میں جو سیاسی بحران پیدا ہوئے ان کے نزدیک اس کی بڑی وجہ اقتصادی آزادی کا فقدان تھا۔ چینی ترکستان میں 1933ء میں جو وسیع پیمانے پر بغاوت ہوئی اس کے پیچھے چین کی استحصالی اقتصادی پالیسیوں کا ہاتھ تھا۔ اس طرح روسی ترکستان کے حالات مخدوش

ہونے کے اسباب میں ایک طرف تو مذہب کش اقدامات تھے تو دوسری طرف روسی حکومت کی طرف سے یہ کوشش کہ سارے خطے کو صنعتی اور زرعی ترقی سے ہم کنار کرنے کی بجائے صرف کپاس پیدا کرنے والا علاقہ بنایا جائے(24)۔ اِقبالؒ نے 1933ء میں افغانستان کے دورے کے بعد اپنے بیان میں اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ افغانستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس سلسلے میں ہمسایہ ممالک سے روابط بڑھانے کے لئے سڑکوں کی تعمیر کر رہا ہے اور اپنے نوجوانوں کی سول انجینئرنگ، طب اور دیگر فنون میں تعلیم دینے کے انتظامات کر رہا ہے۔ ان کی رائے میں اگر افغانستان کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے دس سال امن وامان کے مل جائیں تو افغانستان کی تقدیر بدل جائے گی اور ملک اقتصادی طور پر آزاد ہو جائے گا۔(25)

فکرِ اقبالؒ کا جو خاکہ اُوپر پیش کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِقبالؒ کا یہ خواب کہ قوم کی پاسبانی کے لئے مسلمان متحد ہو کر کام کریں اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک یہ ممالک اقتصادی طور پر آزاد اور مضبوط نہ ہوں۔ اس نصب العین کا حصول اِقبالؒ کے دور میں مشکل نظر آتا تھا لیکن حالیہ دہائیوں میں دُنیا کے مختلف خطوں میں علاقائی معاشی تنظیموں کی حیرت انگیز کامیابیوں نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ اگر ایشیائی اسلامی ممالک بھی انہی خطوط پر اپنے آپ کو منظم کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عالمی انسانی تحریکوں پر اسلام کی اعلیٰ وارفع اقدار کی ترویج کے لئے اثر انداز نہ ہو سکیں۔

II

واضح رہے کہ مقالے کے اس حصے میں اس امر پر صرف اصولی بحث کی گئی ہے کہ ایک مضبوط علاقائی معاشی بلاک کس طرح تشکیل پاتا ہے اور موجودہ دور مسابقت میں ایسے بلاک کی کامیابی کن عوامل کی مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے میں چار نکات پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اوّل یہ مقالہ فی نفسہ علاقائی اقتصادیات (Regional Economics) کے مباحث پر مبنی نہیں، دوئم اگرچہ اکثر نکات کی تائید میں اعداد وشمار پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن یہاں بوجوہ صرف بنیادی نکات پر اکتفا کیا گیا ہے، سوئم مباحث کا رُخ زیادہ تر وسطی

ایشیا کے اسلامی ممالک کے طرف ہے۔ البتہ بحث میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں ان کا اطلاق عالم اسلام کے دیگر خطوں پر بھی ہوسکتا ہے، چہارم اسلامی اتحاد کی ترکیب میں معاشی اور غیر معاشی عناصر دونوں شامل ہیں لیکن یہاں صرف معاشی عوامل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

همه ارضیت اور علاقائیت

قوموں کے درمیان معاشی تعلقات کے نقطۂ نظر سے اس وقت دُنیا میں دو تحریکیں جاری ہیں جنہیں ہمہ ارضیت یا ہمہ عالمیت (globalization) اور علاقائیت (regionalization) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر کا اجراء دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ سے ہوا جو ہولناک جنگ کی وجہ سے معاشی طور پر تباہ ہو چکا تھا، اور اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ مختلف یورپی ممالک اپنے وسائل مجتمع کر کے اور ایک جیسی معاشی پالیسیاں اپنا کر تعمیر نو کریں۔ اس سلسلے میں امریکہ نے بھی اپنے مشہور زمانہ مارشل ایڈ پروگرام کے تحت یورپ کی بھرپور مدد کی۔ یورپی مفکرین، محققین اور سیاست دانوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کی حامی تھی کہ کم از کم مغربی یورپ کو مکمل معاشی اتحاد کے نصب العین کو اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پچھلے پچاس سالوں میں بتدریج بہت سے ایسے اقدامات اٹھائے گئے جو آخر کار اس نصب العین کے حصول کا باعث بنے۔ پہلے کوئلے اور لوہے کے کاروبار کو مدغم کیا گیا۔ پھر اندرونی اور بیرونی تجارتی محصولات کو یکجا کیا گیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ پیداواری اور مالی عوامل اور افرادی قوت کی آزادانہ آمد و رفت کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کی گئیں اور حال ہی میں یورو کی شکل میں ایک مشترکہ کرنسی بھی جاری کر دی گئی ہے۔ اب یورپ کے سیاسی ادغام کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک مشترکہ یورپین پارلیمنٹ بھی معرض وجود میں آ چکی ہے اور یورپ نژاد افراد کے لئے ویزے کی پابندیاں ختم ہو چکی ہیں۔ معاشی تعاون کی اس کوشش کو پہلے یورپین اکنامک کمیونٹی (EEC) اور یورپین کامن مارکیٹ (ECM) کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ اب اتحاد کے روز افزوں اعلیٰ درجوں کو ظاہر کرنے کے لئے یورپین یونین (EU) کا لقب اختیار کیا گیا ہے۔

یورپ کی دیکھا دیکھی دُنیا کے اور علاقوں میں بھی علاقائی معاشی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں(26)۔مثال کے طور پر شمالی امریکہ میں نیفٹا (NAFTA)، جنوب مشرقی ایشیا میں آسیان (ASEAN)، جنوبی ایشیا میں سارک (SAARC)، بحرالکاہل کے دونوں اطراف کے ممالک میں ایپک (APEC) اور وسطی ایشیا میں ایکو (ECO) جو درحقیقت وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک کی ایک نہایت ہی ڈھیلی ڈھالی معاشی تنظیم ہے۔ان تنظیموں کے علاوہ مشرقی اور شمالی یورپ، افریقہ، جنوبی امریکہ اور دُنیا کے مختلف سمندروں میں واقع جزیروں میں بھی دو درجن سے زائد علاقائی معاشی اور تجارتی تعاون کے لئے سمجھوتے ہو چکے ہیں۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی علاقے میں کوئی معاشی تنظیم ابھی اتنی فعال اور مستحکم نہیں ہوئی جتنی یورپین یونین۔ جہاں تک اسلامی دُنیا کا تعلق ہے، تعجب ہے کہ ایشیا کی ایکو کے علاوہ اور کسی جگہ کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے عرب ممالک کے درمیان محدود پیمانے پر سمجھوتے ہوئے ہیں مگر ان سمجھوتوں نے کسی معاشی تنظیم کی شکل اختیار نہیں کی۔

معاشی علاقائیت کی تحریکوں کے برعکس معاشی ہمہ ارضیت یا ہمہ عالمیت (globalization) کی تحریک حال ہی کی پیداوار ہے۔اس تحریک کے ابتدائی عناصر کسی حد تک دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے تحت طے شُدہ تجارت اور محصولات سے متعلق عمومی سمجھوتے (GATT) میں موجود تھے، جس پر 1947ء میں دستخط ہوئے تھے۔اس سمجھوتے کے مطابق چیدہ چیدہ اشیاء اور معاشی عاملیں کی تجارت کے راستے میں حائل محصولات کو آہستہ آہستہ کم کرنا تھا۔پچھلے پچاس سالوں میں اس سمجھوتے پر سات بار نظر ثانی کی گئی۔آخری بار جس مجلس نے اس سمجھوتے میں ترمیم کی اسے یوراگوئے راؤنڈ (Uruguay Round) کہتے ہیں۔اس ترمیم کے بعد مندرجہ بالا سمجھوتے (GATT) کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک نئی عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کو تخلیق کیا گیا جو یکم جنوری 1995ء سے فعال ہوگئی ہے۔یہی تنظیم ہے جو ہمہ ارضیت کی تحریک کی علم بردار ہے۔

معاشی ہمہ ارضیت کی تحریک کے مثبت پہلو بھی ہیں اور منفی پہلو بھی۔مثبت پہلوؤں کا لُبِ لباب یہ ہے کہ سارا کرۂ عرض یکساں طور پر معاشی نمو (economic growth) کے راستے پر گامزن ہو۔اس

مقصد کے لئے آزاد تجارت کے راستے میں مصنوئی رکاوٹیں اور محصولات یا تو ختم یا بہت کم کر دینے چاہئیں۔ مزید برآں روزمرّہ کی تجارت اور معاشی سرگرمیوں میں حکومت کم سے کم مداخلت کرے تا کہ لوگ آزادانہ کاروبار کریں جس سے معاشی ترقی کا عمل تیز رفتار ہو جائے گا۔ مختلف بین الاقوامی کرنسیوں کی تجارت پر بھی کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ ترقی یافتہ قومیں اس سامان پر تجارتی محصولات 40 فیصد کم کر دیں جو وہ ترقی پذیر ممالک سے درآمد کرتی ہیں تا کہ ترقی پذیر ممالک کی برآمدات بڑھیں۔ اسی طرح ترقی پذیر ممالک بھی ترقی یافتہ ممالک سے درآمد کردہ سامان پر تجارتی محصولات میں اضافہ نہ کریں۔ ان امور کے علاوہ زرعی اشیاء، پارچہ جات، ایجادات سے متعلق حقوق اور سرمایہ کی حرکت پذیری کے حوالے سے بھی بہت سے اقدامات پر متذکرہ صدر یوراگوئے راؤنڈ کے تحت سمجھوتے کئے گئے ہیں جن کا مقصد عالمی سطح پر تجارت کو باقاعدہ قانونی طریقے سے فروغ دینا ہے۔ ہمہ ارضیت کے حامی ماہرین معیشت کا خیال ہے کہ دُنیا میں آزاد تجارت کے فروغ سے بہت تھوڑے عرصے میں معاشی سرگرمیوں میں 250 بلین ڈالر کی حد تک اضافہ ہو جائے گا۔ (27)

اگر چہ معاشی ہمہ ارضیت کا تصور ظاہر طور پر بھلا معلوم ہوتا ہے اور تمام خطوں اور قوموں کو ایک عالم گیر رشتے میں پرونا چاہتا ہے لیکن ماہرین کی ایک بڑی تعداد کا یہ خیال ہے کہ اس تحریک سے حاصل ہونے والے معاشی فوائد قوموں کے درمیان غیر ہموار طور پر تقسیم ہوں گے اور غریب اقوام مجموعی طور پر گھاٹے میں رہیں گی (28)۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل، ترقی پذیر ممالک میں بجلی، ذرائع آمدورفت، پٹرول، گیس اور اس نوع کے طبعی اور معاشی ڈھانچے کمزور ہیں۔ لہٰذا یہ ترقی یافتہ اقوام کی مسابقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دوئم، ترقی پذیر ممالک میں محصولات، زر اور سرمایہ کی بنیادیں ضعیف ہیں۔ سوئم، ان ممالک میں افرادی قوت بہت حد تک صحت، تعلیم اور ہنرمندی کی صفات سے محروم ہے۔ چہارم، ان ملکوں میں حکومتیں اوّل تو مضبوط پالیسیاں بنا نہیں سکتیں اور اگر بنا بھی لیں تو ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکتیں۔ پنجم، نجی شعبہ بہت زیادہ پُر اعتماد اور فعال نہیں ہے۔ ششم، امن وامان اور سیاست کی صورتحال اکثر خراب رہتی ہے۔ ہفتم، ان ممالک پر بیرونی قرضوں کا ناقابلِ برداشت بوجھ پڑا ہوا ہے۔

ترقی یافتہ اقوام کے اپنے رویے بھی ہمہ ارضیت کے ممکنہ فوائد کے حصول کی راہ میں حائل ہیں۔ ان اقوام اور خاص طور پر یورپین یونین نے اپنے معاشی مفادات کو بچانے کے لئے حفاظتی معاشی محصولات اور کوٹا سسٹم کی دیواریں بنا رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ سرمایہ کاری کے سارے چشمے ان کی ملکیت میں ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں سرمایہ لگا دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں سرمایہ نکال کر کمزور قوموں کی معیشت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا پچھلی دہائی میں اس متلون مزاج سرمایہ کاری کا مزہ چکھ چکا ہے۔ آجکل پاکستان بھی اس صورتحال کا سامنا کر رہا ہے۔ امیر ملکوں کے کاروباری ادارے (multinational companies) آہستہ آہستہ غریب ممالک کی معیشتوں پر چھا رہے ہیں اور ان ممالک سے حاصل کردہ منافع بڑی مقدار میں واپس اپنے گھروں میں پہنچا رہے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک نے بظاہر عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کے معاہدوں پر دستخط کر رکھے ہیں، لیکن عملاً وہ اپنی اپنی علاقائی معاشی تنظیموں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

ہمہ ارضیت تحریک کا ایک ناخوشگوار تمدنی اور سیاسی پہلو بھی ہے۔ یہ تحریک چونکہ مغرب سے اٹھی ہے لہٰذا اس پر مغرب کے تہذیبی، سماجی اور معاشی تصورات کی گہری چھاپ ہے۔ سفید اقوام کی غیر رُوحانی اور مادی اقدار، زندگی بسر کرنے کے طور طریقے، موسیقی، ادب اور آرٹ، ذرائع ابلاغ اور اسی قسم کے دیگر عناصر دُنیا کو ایک رنگ میں رنگنے کے درپے ہیں۔ آئی۔ ایم۔ ایف اور عالمی بنک ہمہ ارضیت کی تحریک کے زیر اثر معاشی تعاون اور امداد کے لئے جو شرائط عائد کرتے ہیں، ان میں یہ بھی شامل ہے کہ ترقی پذیر ممالک مغربی انداز کے سیاسی اور معاشی ماڈل اپنائیں، چاہے وہ ان کے لئے موزوں ہوں یا غیر موزوں۔ اس لحاظ سے ہمہ ارضیت ایک نظریاتی تحریک ہے جس کا مقصد قدیم سیاسی استعماریت کی جگہ ایک نئی قسم کی اجتماعی استعماریت (corporate colonialism) قائم کرنا ہے جو ہمہ گیر تمدنی اور معاشی بنیادوں پر استوار ہو۔ چونکہ یہ ایک نظریاتی تحریک ہے لہٰذا قدرتی امر ہے کہ دُنیا کی دوسری نظریاتی تحریکوں سے اس کا سامنا ہو، خاص کر اسلام سے جو ایک الگ تمدنی اور سماجی نظام رکھتا ہے۔ یہی وہ خدشہ ہے جس سے متاثر ہو کر ایک مغربی مفکر سیموئل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) نے اپنی مشہور کتاب تہذیبوں کا تصادم اور نئے عالمی نظام کی تشکیل لکھی ہے۔ جس کے مطابق اس نے تمدنی لحاظ سے دُنیا

کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے، مغرب، اسلامی ممالک، بھارت، چین، جاپان، لاطینی امریکہ اور افریقہ، اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مغربی تہذیب کا اصل تصادم اسلام سے ہوگا(29)۔ بقول اقبالؒ ابلیس نے اس حقیقت کا ادراک بہت پہلے کر لیا تھا:

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایّام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

ہمارا موضوع تہذیبوں کا تصادم نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ دُنیا کے معروضی اور زمینی حقائق کے پیش نظر ہمہ ارضیت تحریک کو کامیاب ہوتے ہوئے ابھی کافی عرصہ لگے گا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ آخر کار اس کے خدوخال کیا ہوں گے۔ کرۂ ارض پر اگر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ مختلف قسم کے جغرافیائی اور طبیعی حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ زبان، رنگ اور نسل کے لحاظ سے انسانوں کے بے شمار گروہ ہیں۔ مختلف اقوام اور علاقوں کی تاریخی گہرائیوں میں تنوع ہے۔ اسی طرح مختلف علاقوں اور قوموں کی الگ الگ تہذیبیں اور مذاہب ہیں۔ معاشی ترقی کے معاملے میں بھی مختلف ممالک مختلف مراحل میں ہیں اور سیاسی ڈھانچوں کی شکلیں بھی ایک جیسی نہیں، ان تمام عوامل کو اگر سامنے رکھیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آتی کہ کم از کم اکیسویں صدی میں ہمہ ارضیت کی بجائے علاقائی معاشی تنظیموں کا وجود برقرار بھی رہے گا اور مزید فروغ پائے گا۔ غالباً اسی صورتِ حال کے پیش نظر عالمی تجارتی تنظیم نے علاقائی معاشی تنظیموں کے وجود کو محدود عرصے کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے۔ حال ہی میں آئی۔ ایم۔ ایف اور عالمی بینک کی ہمہ ارضی پالیسیوں کے خلاف امریکہ اور یورپ میں جو مظاہرے ہوئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی اقوام ابھی اپنے علاقائی مفادات کو پس پشت ڈالنے کے لئے تیار نہیں۔ وہاں کے مزدوروں کی انجمنوں کو یقین ہے کہ عالمی تجارتی تنظیم کے زیر اثر تجارتی محصولات کم کرنے سے ترقی پذیر ممالک میں بنی ہوئی اشیاء ترقی یافتہ ممالک میں سستی فروخت ہوں گی اور اس طرح وہاں صنعتی بحران پیدا ہوگا اور بے روزگاری بڑھے گی۔ یہ صورتِ حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ترقی پذیر ممالک بھی اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے اپنی علاقائی معاشی تنظیموں کو مضبوط بنائیں۔ خاص کر وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک جو اس مقالے کا موضوع ہیں۔

علاقائی معاشی بلاک کا جواز

جب کسی خطے میں واقع ایک ہی قسم کی معاشی خصوصیات رکھنے والے ملک آپس میں تجارتی یا دیگر اقتصادی مقاصد کے لئے سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو ان کا علاقائی معاشی بلاک وجود میں آجاتا ہے۔ یہ سمجھوتہ یا تعاون جزوی بھی ہوسکتا ہے اور کلی بھی۔ دونوں صورتوں میں غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ معاشی ترقی کے وسائل کو یکجا کیا جائے جو الگ الگ رہنے کی صورت میں ناکافی ہوتے ہیں۔ ایسے وسائل میں قدرتی ذخائر، تربیت یافتہ افرادی قوت، سرمایہ اور مختلف قسم کے ماہرین اور منتظمین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر بڑے بڑے فوائد یہ ہیں۔ اوّل، اشیاء کی خرید وفروخت کے لئے منڈی یا مارکیٹ کی بنیاد وسیع ہوجاتی ہے، جس سے بلاک کے اندر واقع کارخانے بڑے پیمانے پر سستی اشیاء پیدا کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں اور اس طرح باہمی تجارت میں خاصا اضافہ ہوجاتا ہے۔ دوئم، صارفین کو نسبتاً سستی اشیاء ملنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ سوئم، بلاک میں شامل مختلف ملک مشترکہ پالیسیاں بنا کر اپنے اپنے وسائل کے مطابق صنعتی تخصیص حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح صنعتی ترقی کی رفتا تیز ہوجاتی ہے۔ چہارم، اکثر ترقی پذیر ممالک زرعی معیشت کے حامل ہیں۔ اگر ان کا تعلق ایک ہی معاشی بلاک سے ہو تو وہ آپس میں مل کر زرعی اجناس کی قیمتوں میں استحکام پیدا کر سکتے ہیں۔ پنجم، مشترکہ تجارتی پالیسیاں بنا کر برآمدات میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور اس طرح قیمتی زرِمبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔ ششم، ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ تجارتی لین دین میں کم ترقی یافتہ ممالک اپنی کمزور حیثیت کی وجہ سے اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں۔ مشترکہ معاشی بلاک بنا کر وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ سفید اقوام کے ساتھ تجارتی شرائط طے کر سکتے ہیں۔

علاقائی معاشی تعاون کی وجہ سے حاصل ہونے والے جن فوائد کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے انہیں معمولی نہ سمجھا جائے۔ مغربی یورپ انہی فوائد کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے باہر نکل آیا بلکہ اب ایک زبردست معاشی خوشحالی سے ہم کنار ہو چکا ہے۔ اگر معاشی تعاون ٹھوس بنیادوں پر ہو اور مشکلات پر باہمی افہام وتفہیم سے قابو پانے والے سیاسی اور فنی ادارے موجود ہوں تو مجموعی قومی آمدنی میں اضافے کی رفتار تیز ہوجاتی ہے، وسائل کا ضیاع رُک جاتا ہے، تقسیم دولت زیادہ منصفانہ طریقے سے ہوتی

ہے اور پیداواری قوتیں فروغ پاتی ہیں۔ موجودہ دُنیا غیر منصفانہ طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک حصہ مغربی اقوام کا ہے جنہیں شمال (North) کا لقب دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ کمزور قوموں کا ہے جنہیں جنوب (South) کہا جاتا ہے۔ ان کمزور اور چھوٹی قوموں کے بارے میں اکثر ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کے معاشی مسائل کا ایک ہی مؤثر، طویل المیعاد حل ہے کہ وہ علاقائی، معاشی تعاونی تنظیموں کے ساتھ منسلک ہوں اور تعاون بھی جزوی نہ کریں بلکہ قوم پرستانہ جذبات کی بجائے علاقائی اتحاد کے احساسات کو فروغ دیں اور مکمل معاشی تعاون کی طرف قدم اٹھائیں۔

باہم معاشی تعاون کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ کمزور ترین شکل یہ ہے کہ کسی ایک سیکٹر یا پراجیکٹ پر مشترکہ طور پر کام کیا جائے۔ مثال کے طور پر سرحدوں کو ملانے والی سڑکوں کی تعمیر یا کسی خاص صنعت کو علاقائی بنیادوں پر فروغ دیا جائے یا اشیاء کے کسی خاص گروپ کی باہمی تجارت پر پابندیاں ختم کر دی جائیں جیسے وسائل طاقت بشمول گیس اور پٹرول۔ تعاون کی اس سے زیادہ بہتر شکل وہ ہے جسے آزاد تجارت کا علاقہ (free trade area) کہتے ہیں۔ اس صورت میں معاشی بلاک میں شامل ممالک آپس کی تجارت پر سے تمام محصولات اور پابندیاں ہٹا دیتے ہیں۔ لیکن بلاک سے باہر کے ملکوں کے ساتھ تجارت میں اپنے اپنے مفادات کے حساب سے الگ الگ بیرونی محصولات قائم رکھتے ہیں۔ معاشی تعاون کی اس صورت میں باہمی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بہتر اور مؤثر تعاون کی وہ شکل ہے جس میں اندرونی تجارت تو آزاد ہوتی ہے، لیکن بیرونی تجارت پر تمام رُکن ممالک ایک ہی شرح سے مشترکہ محصولات عائد کرتے ہیں، اسے محصولاتی اتحاد کہتے ہیں۔ تعاون کی اگلی منزل وہ ہے جسے مشترکہ منڈی کے لقب سے پکارا جاتا ہے، اس میں محصولاتی اتحاد کی ساری خصوصیات ہوتی ہیں، اور اس کے علاوہ رُکن ممالک میں افراد اور سرمائے کی آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت ہوتی ہے۔ معاشی تعاون کی آخری اور مکمل شکل وہ ہے، جس میں رُکن ممالک وسیع تر معاشی، سیاسی اور سماجی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مشترکہ کرنسی کا اجراء کرتے ہیں اسے یونین کہا جاسکتا ہے۔ مغربی یورپ آجکل اسی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک نے جو تنظیم برائے معاشی تعاون (ECO) بنا رکھی ہے وہ متذکرہ صدر اقسام تعاون کے کمزور ترین درجے سے بھی نیچے ہے۔ صرف مقاصد کی نشاندہی کی گئی ہے اور متعدد اجلاس بھی ہوئے ہیں لیکن ابھی کوئی قابلِ ذکر مشترکہ پراجیکٹ نہیں بن سکا اور نہ ہی اشیاء کے کسی خاص گروپ کی باہمی تجارت کو درآمدی محصولات سے آزاد کیا گیا ہے۔

شرائط اور چیلنج

معاشی تعاون کے لئے جو گروپ یا بلاک بنائے جاتے ہیں ان کی کامیابی کا دارومدار مندرجہ ذیل عوامل پر ہوتا ہے:

(ا) آپس میں سیاسی مفاہمت اور رواداری ہو۔ ایک دوسرے کی آزادی و خودمختاری کا احترام ہو، اور ہر ملک کے اندرونی سیاسی نظام میں عدم مداخلت کے اصول کی پیروی کی جائے۔ جہاں تک بیرونی ممالک کے ساتھ تعلقات اور خارجہ پالیسی کا سوال ہے اگر اس میں بھی اشتراکِ عمل و فکر ہو تو اس سے باہمی تعاون مستحکم سے مستحکم تر ہو جاتا ہے۔

(ب) باہمی اشتراک میں شامل ممالک کا علاقہ مجموعی طور پر انسانی اور ملکی ضروریات کے حوالے سے وافر مقدار میں وسائل رکھتا ہو اگرچہ ان سے بھرپور استفادہ نہ کیا جا رہا ہو۔

(ج) تمام رُکن ممالک اس بات پر رضامند ہوں کہ وہ تقابلی فوائد کے قانون (law of comparative advantages) کے مطابق اپنے وسائل کو استعمال میں لائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ہر ملک صرف ان اشیاء کی پیدائش میں تخصیص حاصل کرے جن پر اسے قدرتی یا اکتسابی فوقیت حاصل ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ خود کفالت کی پالیسی کی بجائے مجموعی کفالت کا راستہ اختیار کیا جائے۔

(د) رُکن ممالک کو آپس میں ملانے والا کوئی ٹھوس مشترکہ عنصر موجود ہو جیسے مذہبی، تمدنی اور تاریخی رشتے یا باہمی سیاسی اور معاشی مفادات۔

(ر) معاشی تعاون کرنے والے ممالک کے علاقے جغرافیائی یا طبیعی طور پر متصل ہوں۔

مندرجہ بالا عوامل معاشی تعاون یا اتحاد کے لئے ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی موجودگی میں کوئی مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ ہر ملک اپنا ایک الگ معاشی، صنعتی اور زرعی ڈھانچہ رکھتا ہے۔ ہر ملک کی حکومت اپنے انداز سے بجٹ بناتی ہے اور محاصل وصول کرتی ہے۔ اس طرح اشیاء کی پیدائش اور قیمتوں کا نظام بھی مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا جب مختلف معیشتوں کو آپس میں مدغم کیا جائے تو اس سے کئی تکلیف دہ مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں چار مسائل قابلِ ذکر ہیں:

اوّل جب باہمی تجارت کو فروغ دینے کے لئے درآمدی یا برآمدی محصولات ہٹائے جاتے ہیں یا کم کئے جاتے ہیں تو اس سے حکومتوں کی آمدنیاں کم ہو جاتی ہیں اور سرکاری میزانیے دباؤ میں آ جاتے ہیں۔

دوئم باہمی اشتراک کی وجہ سے صنعتی مسابقت پیدا ہو سکتی ہے اور برسوں سے قائم شدہ صنعتی ڈھانچہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہر ملک میں ایک ہی قسم کی اشیاء پیدا کرنے والے کارخانے موجود ہوں۔ ان میں سے کچھ کارخانے کم لاگت سے اشیاء بناتے ہوں لہٰذا ان کی مسابقت کی وجہ سے دوسرے ملک کے زیادہ لاگت سے اشیاء بنانے والے کارخانے متاثر ہو سکتے ہیں اور بند ہو سکتے ہیں اور اس طرح بے روزگاری بڑھ سکتی ہے۔

سوئم معاشی تعاون سے حاصل ہونے والے فوائد رُکن ممالک میں غیر منصفانہ طریقے سے تقسیم ہو سکتے ہیں۔ جو رُکن ممالک بڑے ہوں اور صنعتی طور پر زیادہ منظم ہوں وہ چھوٹے اور غیر منظم اراکین کے مقابلے میں زیادہ فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

چہارم تجارت میں انحراف (diversion) پیدا ہو سکتا ہے۔ اس معاشی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ کسی ملک کے صارفین اشتراک سے پہلے جو اشیاء دوسرے ممالک سے درآمد کرتے تھے وہ سستی پڑتی تھیں۔ اشتراک کے بعد رُکن ممالک مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اشیاء بلاک کے

اندر سے ہی خریدیں، چاہے وہ مہنگی ہی کیوں نہ پڑیں۔

یہ مسائل ناقابلِ حل نہیں ہیں۔ معاشی تعاون کی جتنی کوششیں اب تک ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر معاشی بلاک مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور مندرجہ ذیل اقدامات بروقت کئے جائیں تو مشکلات سے بچا جاسکتا ہے اور اگر مسائل پیدا ہو بھی جائیں تو انہیں دُور بھی کیا جاسکتا ہے:

۱۔ رُکن ممالک اپنی قومی ترقیاتی پالیسیاں باہمی صلاح اور مشورے سے بنائیں تاکہ شروع ہی میں مسائل کا صحیح ادراک ہو سکے اور ان کے حل کی تدابیر اختیار کی جاسکیں۔

۲۔ صنعتوں کے قیام (localization) اور فروغ کے لئے مشترکہ منصوبے یا پالیسیاں بنائی جائیں اور اس سلسلے میں مقامی تخصیص میں مددگار عناصر کا پورا خیال رکھا جائے۔

۳۔ ایک علاقائی ترقیاتی بینک قائم کیا جائے جو ترقیاتی کاموں سے متعلق سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کرے اور علاقے کے دیگر بینکوں کے لئے راہ نما اصول مرتب کرے۔

۴۔ بلاک میں شامل ممالک اپنے بجٹ اس طرح مرتب کریں کہ اگر کسی علاقے کے باشندے یا صنعتیں منصفانہ طریقے سے اشتراک کے فوائد حاصل نہ کر رہی ہوں تو انہیں خاص مراعات دی جائیں یا ان کی مالی مدد کی جائے۔

۵۔ عاملینِ پیدائش کی آزادانہ نقل و حرکت کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ کوئی ملک ان عاملین کی کمی کا شکار نہ ہو۔

۶۔ قومی اہمیت یا خدمات کے منصوبوں کے بالائی اخراجات (overhead expenses) بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے تمام رُکن ممالک مطلوبہ وسائل کو مل کر اکٹھا کریں اور ان سے استفادہ کریں۔

کامیاب تجربے

معاشی تعاون کا سب سے زیادہ کامیاب تجربہ یورپ میں ہوا ہے جو صدیوں کی باہمی چپقلش اور جنگوں کے بعد معاشی خوشحالی کے احساس کے تحت تیزی کے ساتھ مکمل معاشی اتحاد کی طرف گامزن ہو گیا ہے۔ یورپی یونین (EU) کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے جس نے 1992ء تک اندرونی تجارت کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دور کر دی تھیں۔ یورپ کی مثال نے دُنیا کی کئی چھوٹی اور درمیانی قوموں کو باہمی اشتراک پر مائل کیا ہے۔ کچھ تجربے ناکام بھی ہوئے ہیں کیونکہ وہ متذکرہ صدر شرائط کو پورا نہیں کرتے تھے اور سیاسی تدبر اور علاقائی اشتراک کے جذبوں سے خالی تھے۔ مثلاً 1970ء کی دہائی میں سنٹرل امریکن کامن مارکیٹ (Central American Common Market) اور ایسٹ افریقن کمیونٹی (East African Community) کے تجربے مکمل طور پر ناکام ہو گئے۔ اس طرح جنوبی ایشیا میں سارک (SAARC) کی تنظیم بھی سیاسی تنازعوں کی وجہ سے کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ لیکن حال ہی کی دہائیوں میں اشتراک کے بہت سے تجربے کامیابی سے ہم کنار ہو رہے ہیں۔

چند کامیاب تجربوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (30)۔ شمالی امریکہ میں کینیڈا، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور میکسیکو نے نیفٹا (NAFTA) کے نام سے ایک باہمی تجارتی ایسوسی ایشن آزاد تجارت کے اصول پر قائم کی ہے جس سے تجارتی لین دین میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لاطینی امریکہ میں ارجنٹائن، برازیل، پیراگوائے، اور یوراگوائے نے 1994ء میں آزاد تجارتی علاقہ قائم کیا ہے جسے مرکوسر (Mercosur) یا South Cone Common Market کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس اقدام نے رُکن ممالک کی باہمی تجارت میں تین گنا اضافہ کیا ہے جس کی مالیت 12 بلین ڈالر بتائی جاتی ہے۔ ان ممالک کی کل آبادی 18 کروڑ ہے اور ان کی معاشی سرگرمیوں کا حجم 800 بلین ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان ممالک نے باہمی اشتراک سے منڈی کے دائرے کو بہت وسیع کر لیا ہے۔ لاطینی امریکہ میں ایک اور معاشی بلاک اینڈین گروپ (Andean Group) کی شکل میں نمودار ہوا ہے جس نے 1994ء میں بھرپور انداز سے مشترکہ منڈی (Common Market) قائم کر لی ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی افریقہ میں 10

ممالک نے ایک علاقائی معاشی گروپ سیڈک (South African Development Community) کے نام سے بنایا ہے، جس کی وجہ سے معاشی سرگرمیوں میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

ایک بات بالکل واضح ہے کہ تیسری دُنیا کے ممالک اپنے اپنے علاقوں میں معاشی بلاک بنا کر بیرونی اور اندرونی تجارت میں بہت اضافہ کر سکتے ہیں۔ خاص کر اس صورت میں جب وہ صنعتی ترقی کے ایک ہی جیسے درجے میں ہوں اور انہیں اس بات کا شدید احساس ہو کہ وہ مشترکہ صنعتی منصوبے مرتب کرنے میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر تعاون کر سکتے ہیں۔ ایسے معاشی بلاک طویل المیعاد معاشی ترقی کے راستے بھی آسان کر دیتے ہیں اور اپنے اراکین کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ مغربی اقوام کے طاقتور تجارتی اور صنعتی اداروں (multinational companies) پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنے ادارے خود قائم کریں اور بین الاقوامی تجارتی لین دین میں مغربی اقوام کے ہاتھوں زک نہ اٹھائیں۔ اس کے علاوہ معاشی بلاک بنانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہمہ ارضیت کے منفی پہلوؤں سے بچا جا سکتا ہے اور اس کے مثبت اثرات سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

عالمِ اسلام

معاشی تعاون کے حوالے سے اب تک جو بحث کی گئی ہے وہ فنی نوعیت کی ہے، لیکن اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ معاشی خوشحالی اور معاشی قوت کے حصول کے لئے عالمی سطح پر کس قسم کے افکار و اعمال پرورش پا رہے ہیں تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ اس پس منظر میں عالمِ اسلام عمومی طور پر اور وسطی ایشیا کی اسلامی ریاستیں خصوصی طور پر کہاں کھڑی ہیں؟ عالمِ اسلام کم و بیش ان تمام شرائط پر پورا اترتا ہے جو کامیاب معاشی بلاک کے قیام میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی اسلامی علاقے میں صحیح معنوں میں کوئی علاقائی معاشی تنظیم قائم نہیں ہو سکی۔ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے اسلامی دُنیا کا حجم بہت بڑا ہے۔ اگر روس، چین، بھارت، یورپ اور دیگر غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کو الگ کر کے دیکھیں تو صرف اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب سے زائد ہے اور ان ملکوں کا رقبہ 13 ملین مربع میل پر مشتمل ہے جو یورپین

یونین کے رقبے سے 24 گنا زائد ہے۔ اسلامی علاقے بحرِ اوقیانوس کے مشرقی سواحل سے لے کر بحرِ الکاہل کے مغربی سواحل تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اشیاء کی کھپت اور تجارت کے لئے ایک بہت ہی وسیع مارکیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تقریباً تمام سمندری تجارتی راستے اسلامی علاقوں سے گذرتے ہیں۔ جبرالٹر، سویز، عدن اور سنگاپور کا محلِ وقوع تجارتی جہازوں کی آمدورفت کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی امتیازات کو چھوڑ کر تمام اسلامی ممالک پر ایک ہی قسم کے تمدن کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے درمیان اکثر و بیشتر مضبوط تاریخی روابط موجود ہیں۔ ان ممالک کا غالب حصہ جغرافیائی طور پر متصل ہے جس سے آمدورفت میں بہت آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ چند ممالک کو چھوڑ کر عام طور پر ان کے درمیان بہت گہرے سیاسی جھگڑے بھی نہیں۔ (31)

مندرجہ بالا امور کے علاوہ وسیع و عریض اسلامی دُنیا میں دو اور مشترکہ خصوصیات بھی ہیں جو معاشی تعاون کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ اوّل ہر نوع کے وسائل کی بہتاب اور دوئم تیل پیدا کرنے والے ممالک کو چھوڑ کر باقی عالمِ اسلام کی معاشی پس ماندگی۔ جہاں تک قدرتی وسائل کا تعلق ہے یہ اگرچہ غیر ہموار طریقے سے پھیلے ہوئے ہیں لیکن مؤثر منصوبہ بندی کے ذریعے ان سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ان میں تیل، گیس، زرخیز زرعی زمینیں، صنعتی معدنیات، آبی وسائل اور ذرائع آمدورفت کے لئے بنیادی قدرتی سہولتیں شامل ہیں۔ افرادی قوت بھی غیر ہموار طور پر تقسیم ہے لیکن اسے بھی منصوبہ بندی اور تربیت کے جدید طریقوں سے معاشی طور پر فعال بنایا جاسکتا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کے زرِمبادلہ کے ذخائر یورپی اور امریکی بنکوں کی تجوریوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو بھی منصوبہ بندی کے تحت ترقیاتی کاموں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وسائل کی بہتاب کے باوجود اسلامی دُنیا مجموعی حیثیت سے معاشی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ تعلیم، صحت اور دیگر سماجی شعبوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سرکاری شعبوں کی کارکردگی ناقص ہے۔ بے شمار افراد خطِ غربت سے نیچے رہتے ہیں۔ آمدنیوں میں بہت زیادہ غیر ہمواریت ہے۔ شہری سہولتیں پریشان کن حد تک ناکافی ہیں۔ امن و امان کے مسائل، بدعنوانی، انسانی حقوق کی پامالی اور اس نوع کی سماجی برائیاں پھیلی ہوئی ہیں۔

ان مسائل پر قابو پانے کے لئے معاشی تعاون کی حکمت عملی بہت اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ جب وسائل موجود ہوں اور باہمی تعاون کے تمدنی اور معاشی عوامل بھی کارفرما ہوں تو پھر اقتصادی اتحاد کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ اسلامی دُنیا اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ شاید ایک معاشی بلاک کا تصور نا قابلِ عمل ہو۔ عرب اور غیر عرب ممالک علیحدہ علیحدہ معاشی بلاک بنا سکتے ہیں اور ان بلاکوں کے اندر بھی ذیلی گروپ بن سکتے ہیں۔ مثلاً عرب دُنیا میں خلیجی ریاستیں، مشرق وسطیٰ، اور شمالی افریقہ کے ممالک الگ الگ معاشی تنظیمیں بنا کر آپس میں وسیع تر باہمی روابط پیدا کر سکتے ہیں۔ خلیجی ریاستوں نے باہمی تعاون کے لئے ایک نیم سیاسی تنظیم بنا رکھی ہے لیکن اس کا کوئی مربوط معاشی ایجنڈا نہیں۔ اس میں چھ ریاستیں شامل ہیں اور ان کی تنظیم کا نام خلیجی تعاونی کونسل (Gulf Cooperation Council) ہے۔ اس طرح لیبیا، تیونس، الجزائر، موریطانیہ اور مراکش نے 1989ء میں ایک باہمی یونین بنانے کا اعلان کیا تھا لیکن یہ ابھی تک ایک غیر مؤثر تنظیم ثابت ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خصوصی طور پر شمالی افریقہ کے عرب ممالک کا سامنا بحرِ روم کے شمال میں واقع طاقتور یورپین یونین سے ہے جو ان کے قریب واقع ہونے کے باوجود معاشی طور پر ان سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ یورپ میں 40 لاکھ سے زیادہ عرب باشندے قیام پذیر ہیں۔ ان کی موجودگی یورپ کے ساتھ لین دین میں عرب ممالک کی پوزیشن مستحکم کرسکتی ہے بشرطیکہ یہ ممالک اپنے آپ کو کسی معاشی تنظیم کی شکل میں منظم کریں اور اپنے معاشی حالات درست کریں۔ تعجب ہے کہ یورپین یونین کی قربت نے بھی عرب ممالک کو معاشی اتحاد کے فوائد کا ابھی تک احساس نہیں دلایا۔ (32)

وسطی ایشیائی ممالک

غیر عرب دُنیا میں وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک ایک مؤثر معاشی بلاک بنانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے انہوں نے ایک تنظیم برائے معاشی تعاون (Economic Cooperation Organization) بھی بنا رکھی ہے، لیکن اس تنظیم نے ابھی تک کوئی ایسے مؤثر قدم نہیں اٹھائے جس سے ان کے درمیان آزادانہ تجارت ہو سکے یا عاملینِ پیدائش کی بلا روک ٹوک نقل وحرکت ہو سکے۔ اس تنظیم کا ابتدائی تصور 1964ء میں پیش کیا گیا جس کے تحت علاقائی

تعاون برائے ترقی (Regional Cooperation for Development) نامی تنظیم معرضِ وجود میں آئی۔ ابتداء میں اس کے اراکین میں پاکستان، ایران اور ترکی تھے۔ 1985ء میں اس کا نام بدل کر ایکو رکھ دیا گیا۔ 1990 میں معاہدہ ازمیر کے تحت اسے قانونی تحفظ دیا گیا اور 1992ء میں اس کے اراکین میں سابق سویت روس کی چھ مسلم ریاستوں کو شامل کرلیا گیا۔ یہ ایک قسم کی بین الحکومتی علاقائی تنظیم ہے جس کے دس اراکین ہیں اور اس کا صدر دفتر تہران میں ہے۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ تین اداروں پر مشتمل ہے۔ اوّل، وزراء کی کونسل جس میں رُکن ممالک کے وزرائے خارجہ شامل ہوتے ہیں اور جو سب سے اعلیٰ پالیسی ساز ادارہ ہے۔ دوئم، مستقل نمائندوں کی کونسل جو رُکن ممالک کے سفیروں پر مشتمل ہوتی ہے اور تعاون سے متعلق مسائل کی نشاندہی کرتی ہے۔ سوئم، علاقائی منصوبہ بندی کونسل جو متعلقہ ممالک کے منصوبہ بندی کے اداروں کے سربراہوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ایکو کے مقاصد کے حصول کے لئے منصوبے تیار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر دو سال کے بعد رُکن ممالک کے سربراہان کے اجلاس ہوتے ہیں جو تمام پروگراموں کا جائزہ لے کر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ اب تک سربراہان کے پانچ اجلاس ہو چکے ہیں۔

اگر ایکو کے مقاصد اور پروگراموں پر نظر ڈالی جائے تو وہ خاصے بھرپور نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایکو نے باہمی تعاون کے لئے چار شعبے منتخب کئے ہیں۔ (۱) ذرائع نقل وحمل، (۲) تجارت اور سرمایہ کاری، (۳) وسائل قوت، معدنیات اور ماحولیات، اور (۴) صنعت اور زراعت۔ اس کے علاوہ چھ علاقائی ادارے بھی قائم کئے ہیں۔ (۱) تجارتی اور ترقیاتی بینک، (۲) ری انشورنس کمپنی، (۳) جہاز رانی کی کمپنی، (۴) ایکوایر، (۵) چیمبر آف کامرس، اور (۶) انشورنس کالج۔ اس کے علاوہ مخصوص ایجنسیاں بھی ہیں: کلچرل انسٹی ٹیوٹ اور سائنس فاؤنڈیشن۔

یہ تمام ادارے اور مقاصد خوش کن ہیں مگر محض ان کا وجود مؤثر معاشی تنظیم کو وجود میں لانے کے لئے ناکافی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علاقائی معاشی تعاون کے جو معروف اور متحرک طریقے ہیں ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً ابتدائی طور پر کسی ایک منافع بخش سیکٹر یا پراجیکٹ کو لے کر اس کی پیداوار اور تجارت کو کنٹرول کرنے والی ایک علاقائی اتھارٹی قائم کی جائے۔ یورپ نے معاشی تعاون کے

لئے 1953ء میں پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ لوہے اور کوئلے کی پیداوار اور تقسیم کو کنٹرول کرنے والی ایک اتھارٹی قائم کی تھی جسے European Coal and Steel Community کا نام دیا گیا تھا۔ ایکو کے ممالک گیس کے حوالے سے اس قسم کی اتھارٹی قائم کر سکتے ہیں کیونکہ گیس اکثر رُکن ممالک میں پائی جاتی ہے۔ معاشی تعاون کو مؤثر طریقے سے فروغ دینے کے لئے دوسرا قدم یہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ باہمی تجارت کو جزوی یا کلی طور پر آزاد کر دیا جائے یعنی ایکو کا آزاد تجارت کا علاقہ (ECO Free Trade Area) قائم کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں باہمی اندرونی تجارت پر سے تمام محصولات اور پابندیاں ہٹا دیں یا بہت کم کر دیں۔ یہ اقدامات ایکو کے تاجروں اور صنعت کاروں کو متحرک کر دیں گے اور مزید تعاون کے راستے کھولنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ شروع شروع میں ان اقدامات سے مسابقت کی وجہ سے مقامی تاجروں اور صنعتکاروں کے لئے مشکلات پیدا ہوں لیکن اس کا تدارک باہمی گفت وشنید اور مناسب احتیاطی تدابیر سے ہوسکتا ہے۔

چونکہ ایکو نے علاقائی معاشی تعاون کی تجارت سے متعلق آزمودہ حکمت عملی کو ابھی تک اختیار نہیں کیا اس لئے اسے کاغذی تنظیم ہی کہا جاسکتا ہے، حالانکہ یہ ایشیا کا مضبوط ترین اقتصادی بلاک بن سکتا ہے۔ ایکو کے تمام ممالک جغرافیائی طور پر باہم متصل ہیں۔ زرخیز زرعی زمینوں اور وافر آبی وسائل کے مالک ہیں۔ صنعتی اور حساس معدنیات سے مالا مال ہیں۔ 35 کروڑ افراد پر مشتمل ایک وسیع مارکیٹ رکھتے ہیں جو 78 لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ گہرے مذہبی اور تمدنی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ افغانستان کی خانہ جنگی کی وجہ سے آمد و رفت کے راستے غیر محفوظ ہیں مگر اُمید کی جاسکتی ہے کہ یہ خانہ جنگی زُود یا بدیر ختم ہو جائے گی۔

اس مقالے کے آخر میں ایکو کے 10 ارکان سے متعلق ایک منتخب جدول دیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک وسائل رکھنے کے باوجود معاشی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ ایکو کو ایک مؤثر معاشی تنظیم میں منسلک کریں۔ سوائے ترکی، ایران اور قزاقستان کے باقی ممالک کی فی کس آمدنی 340 سے 940 ڈالر کے درمیان ہے جو بہت تھوڑی

ہے۔ کرغستان کو چھوڑ کر دیگر ممالک کی قومی آمدنی کی سالانہ شرح نمو یا تو منفی ہے یا فقط ایک سے 1.7 فی صد۔ البتہ فی مربع کلومیٹر آبادی کا دباؤ زیادہ نہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ (33) فی کس آمدنی کا کم ہونا اور قومی آمدنی کی شرح نمو کا منفی ہونا معاشی طور پر ایک پریشان کن صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے۔ البتہ پس ماندگی کے اس چنگل سے نکلنا ناممکن نہیں بشرطیکہ ایکو کے رُکن ممالک اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے ایک مضبوط معاشی بلاک قائم کرنے کے طرف توجہ دیں۔

نتیجہ خیز حکمت عملی

اگر ایکو ابھی تک ایک مضبوط معاشی بلاک کی شکل اختیار نہیں کر سکا تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ رُکن ممالک کے دانشوروں، پالیسی سازوں، تاجروں، صنعتکاروں اور ماہرین کو معاشی تعاون کی برکات و فوائد سے پوری طرح آگاہی نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ فکرِ اقبالؒ کے اس پہلو سے پوری طرح آشنا ہوئے ہیں کہ سر زمین ایشیا کی پاسبانی کا حق صرف ایک مضبوط اسلامی بلاک ہی ادا کر سکتا ہے۔

یہ نکتہ سر گزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یورپ نے باہمی تعاون کے ذریعے خوشحالی اور قوت حاصل کرنے کے بارے اپنے لوگوں میں شعور کیسے پیدا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے اہل یورپ تنگ آ چکے تھے اور مستقل امن کے متلاشی تھے لیکن اس کے باوجود کوئی یورپی ملک اپنا تشخص چھوڑ کر ایک واحد یورپ کے تصور کو اپنانے پر تیار نہ تھا۔ البتہ یورپ کے اتحاد کے حامی چند مفکرین اور مدبرین نے واحد یورپ کے تصور کو پھیلانے کے لئے ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کیا جسے OECD (Organization for Economic Cooperation and Development) کا نام دیا۔

اس ادارے نے تین کام کئے۔ اوّل، یورپ کے معاشی تعاون کو فروغ دینے کے لئے مستند اعداد و شمار کی مدد سے قابلِ عمل پراجیکٹس اور منصوبے تیار کئے۔ دوئم، یورپی حکومتوں کے ساتھ روابط قائم کر کے ان منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے ان کو تیار کیا۔ سوئم، ذرائع ابلاغ کے ذریعے یورپ کی مشترکہ منڈی کے تصور کو عام تاجروں، صنعتکاروں، بینکاروں اور اہلِ علم و دانش میں پھیلایا۔ OECD کی حکمت عملی نے چند سالوں کے اندر کم از کم مغربی یورپ میں اتحاد کی تحریک کو اتنی وسعت دی کہ آخر کار جرمنی اور فرانس جیسے پرانے دشمن بھی یکجا ہو گئے۔ OECD کی تنظیم اب بھی باقی ہے اور اسی طرح فعال ہے جیسے پہلے تھی۔

ہمیں OECD کے خطوط پر ایک ٹھوس تحقیقاتی ادارہ قائم کرنا چاہیے جو ایکو کے معاشی حالات کا مستند انداز سے جائزہ لے کر حکومتوں، تاجروں، صنعتکاوں اور بینکاروں کی رہنمائی کرے کہ کن شعبوں میں معاشی تعاون کے امکانات موجود ہیں اور اس تعاون سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی مشکلات پیدا ہوں تو انہیں کیسے حل کیا جائے۔ اس کے علاوہ فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں مسلم ایشیا کے ممکنہ عالمی کردار کے بارے میں بھی ذرائع ابلاغ کے ذریعے قوم میں شعور پیدا کیا جائے۔

مجوزہ تحقیقاتی ادارے کو جن امور پر فوری توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہیں:

۱۔ جزوی یا کلی طور پر آزاد تجارتی علاقہ قائم کرنے کے امکانات

۲۔ تیل اور گیس کی مشترکہ اتھارٹی

۳۔ تجارت کے حوالے سے باہمی ادائیگیوں کے لئے کسی علاقائی کرنسی کا اجراء

۴۔ مشترکہ بینکاری

۵۔ گندم اور کپاس کے بارے میں مشترکہ پالیسی

۶۔ قومی اور صنعتی ڈھانچے تعمیر کرنے کے لئے مشترکہ منصوبے

۷۔ بری، بحری اور ہوائی ذرائع آمد و رفت کا علاقائی بنیادوں پر فروغ

خطبات بیاد اقبال

۸۔ دفاعی ساز و سامان بنانے کے علاقائی منصوبے

۹۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر فنی اور تعلیمی شعبوں میں اشتراکِ عمل

(1999)

(1999)

ECO
Selected Basic Indicators 1996-97

Countries	Area 000 sq KM	Population M	Population Density per sq KM	Population Growth Rate %	Life Expectancy Years	GNP per capita US $	Real Growth Rate per capita
Afghanistan	652	24.2	37	2.8	45	–	–
Azerbaijan	87	7.6	87	1.0	69	480	–18.7
Iran	1648	62.2	38	2.5	70	2900 (1995)	1.0
Kazakhstan	2717	16.5	6	–0.3	65	1350	–10.3
Kyrgyz Republic	198	4.6	23	0.7	67	550	12.7
Pakistan	796	133.5	168	2.9	63	480	1.1
Tajikistan	141	5.9	42	1.9	69	340	–18.5
Turkey	779	62.3	80	1.8	69	2830	1.7
Turkmenistan	488	4.6	9	3.8	66	940	–13.1
Uzbekistan	276	24.1	125 per sq M	1.9	69	870	–1.8
Total	7782	345.5					

Source: Islamic Development Bank, *Annual Report 1997-98*. Jeddah: IDB, 1998. Statistical Appendix, Table 1.

حواشی

1 اقبال احمد صدیقی (مترجم)، علامہ محمد اِقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات - اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1999ء، ص342۔

2 ایضاً، ص339۔

3 Mahbubul Haq, *Human Development in South Asia*. Oxford University Press, Karachi, 1999. See *Overview*.

4 اقبال، کلیات فارسی۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، 1973، ص826۔

5 اقبال احمد صدیقی، ایضاً، ص60۔

6 ایضاً، ص305۔

7 ایضاً، ص295۔

8 دیکھئے اقبال کے دو اہم مضامین بعنوان ''اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی تصور'' اور ''مسلم فرقہ ایک عمرانی مطالعہ''۔ ایضاً، ص ص 251-117۔

9 ایضاً، ص ص 44-43۔

10 Allama Iqbal, *Reconstruction of Religious Thought in Islam*. Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1986, p. 126.

11 افتخار صدیقی، شذراتِ فکر اِقبال۔ مجلس ترقی ادب، لاہور، 1973۔ ص55۔

12 اقبال احمد صدیقی، ایضاً۔ ص ص 276-273 اور 295-292۔

13 B. A. Dar, *Letters and Writings of Iqbal*. Iqbal Academy, Karachi, 1967, pp. 55-57.

14 محمد رفیق افضل، گفتارِ اِقبال۔ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، 1977، ص 176۔

15 معین الدین عقیل، اِقبال اور جدید دُنیائے اسلام۔مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، لاہور، 1986، ص 204۔

16 اقبال، کلیاتِ فارسی۔ایضاً، ص182۔

17 Abdul Haq, Iqbal's Concept of Spiritual Democracy. *Iqbal*, Journal of Iqbal Academy Pakistan, Oct-Dec 1986, pp. 63-72.

18 رفیق احمد، اقبال کے معاشی افکار اور آج کا پاکستان۔پاکستان سٹڈی سنٹر، لاہور، 1994، ص ص 22-20۔

19 ایضاً، ص ص 22-20۔

20 سعید اے شیخ، اقوالِ اِقبال۔رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ص 41۔

21 اقبال احمد صدیقی، ایضاً، ص 273۔

22 علامہ اقبال، علم الاقتصاد۔اقبال اکادمی، لاہور، ص ص 31-30۔

23 اقبال احمد صدیقی، ایضاً، ص ص 251-250۔

24 ایضاً، ص ص 311-309۔

25 ایضاً، ص ص 324-323۔

26 Michael P. Todero, *Economic Development*. Longman, London, 1997, p. 486.

27 J. Mander and E. Goldsmith, eds., *The Case Against the Global Economy*. Sierra Club Books, San Francisco, 1996, p. 4.

28 *Ibid*, pp. 44-49.

29 Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order*. Simon and Schuster, New York, 1996. See Part IV.

30 For details see (*i*) *World Development Report 1991*. World Bank, Washington, 1991, pp. 105-108; and (*ii*) Michael P. Todaro, *op. cit.*, pp. 484-486.

31 Zahid Malik, *Reemerging Muslim World*. National Book Foundation, Lahore. See article on "Muslim World's Economic Relations" by Rafique Ahmed, pp. 66-79.

32 Andreas Jacobs, Obstacles to Cooperation Between Europe and the Arab World. *Aussin Politik*. Hamburg, Volume 47, 1st October 1996, pp. 61-70.

33 Islamic Development Bank, *Annual Report 1997-1998*. Jeddah, 1998. Statistical Annex, Table 1.